کرناٹکا ہائی کورٹ کا حجاب پر متنازع فیصلہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد مشتاق احمد ○

جنوبی بھارت کی ریاست کرناٹکا میں حجاب کے تنازعے میں آخرکار بات ہائی کورٹ تک جا پہنچی، کیونکہ کئی درخواست گزاروں نے ہائی کورٹ میں رٹ درخواستیں دائر کردی تھیں۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ عدالت میں لے جانے کے بجائے سیاسی طور پر دباؤ بڑھا کر مسئلہ حل کرنا ہی مناسب تھا۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ عدالت میں جانے سے بھارت کے آئین کے تحت دیے گئے سیکولر بندوبست کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی جسے بھارت کے بہت سارے مسلمان اپنے دینی شعائر اور تصورات کی حفاظت کے لیے کافی سمجھتے تھے۔

کرناٹکا ہائی کورٹ کے ۱۵ مارچ ۲۰۲۲ء کے زیرنظر فیصلے نے واضح کردیا کہ 'سیکولرزم' کا مطلب مذہبی رواداری نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب 'مذہب کو غیر مذہبی تصورات اور اقدار کے ماتحت رکھ کر مذہب کو محدود کردینا ہے'۔ اس فیصلے نے یہ حقیقت بھی آشکارا کردی ہے کہ سیکولرزم کسی مذہب کو صرف اسی حد تک برداشت کرسکتا ہے، جس حد تک وہ غیر مذہبی اقدار کی بالادستی کے لیے خطرہ نہ بنے۔ دوسرے لفظوں میں سیکولرزم اپنے فلٹر میں سے گزار کر ہی مذہب کو قابلِ برداشت مان سکتا ہے، اور مذہب کا جو حصّہ اس فلٹر میں سے نہ گزر سکے، اسے ریاستی جبر کے ذریعے کچل دینا، سیکولر ریاستی بندوبست میں ضروری ہوجاتا ہے۔ اسی طرح مذہب کی وہی تعبیر سیکولر بندوبست کے تحت قابلِ قبول ہوسکتی ہے جو سیکولر بندوبست کے ساتھ متصادم نہ ہو۔ چنانچہ اس لحاظ سے یہ فیصلہ نہایت خوش آیند ہے کہ اس نے سیکولرزم اور مذہب کے تعلق کی حقیقت واضح کردی ہے۔

○ چیئرمین، شعبہ قانون، میرپور یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، میرپور، آزاد جموں وکشمیر

اس مضمون میں زیر بحث فیصلے کے اہم نکات پر مختصر تبصرہ کیا جائے گا، لیکن اس سے قبل اس مقدمے کے متعلق چند بنیادی حقائق پر نظر ڈالنا ضروری ہے:

فیصلے کا قانونی پس منظر

اس مقدمے میں سات مختلف رٹ درخواستیں دائر کی گئی تھیں:

ایک درخواست میں استدعا کی گئی تھی کہ ''عدالت، اسکول اور دیگر حکام کو حکم جاری کردے کہ وہ درخواست گزار خواتین کو کلاس روم میں حجاب پہننے سے نہ روکے، کیونکہ حجاب ان کے مذہب (اسلام) کا لازمی حصّہ ہے، جس کی حفاظت کی ضمانت بھارت کے آئین میں دی گئی ہے''۔

دوسری درخواست میں عدالت سے استدعا کی گئی تھی کہ ''اسکول انتظامیہ، ان افراد کے خلاف انکوائری کروائے جن کی وجہ سے حجاب کا تنازعہ پیدا ہوا''۔

تین درخواستوں میں حکومت کے اس حکم نامے کو کالعدم قرار دینے کی استدعا کی گئی تھی، جس کی بنا پر حجاب کا تنازعہ اٹھا، جب کہ دو درخواستیں 'عوامی مفاد کا مقدمہ' (public interest litigation) کی نوعیت کی تھیں، جن میں ایک میں استدعا کی گئی تھی کہ ''عدالت قرار دے کہ مسلمان خواتین کو حجاب پہننے کی اجازت ہے بہ شرطے کہ وہ یونیفارم بھی پہنیں''، جب کہ دوسری درخواست میں ''بعض 'بنیاد پرست' مسلمان تنظیموں اور جماعتِ اسلامی کے خلاف تحقیقات کی استدعا'' (ص ۳۲) کی گئی تھی۔

کرناٹکا ہائی کورٹ میں پہلے ایک جج (جسٹس کرشنا ڈکشٹ) نے درخواستیں سنیں، لیکن معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر انھوں نے اسے چیف جسٹس (جسٹس ریتو راج اوستھی) کے سامنے رکھا کہ ''اس کے متعلق بڑا بنچ تشکیل دینے کے بارے میں فیصلہ کریں۔ چیف جسٹس نے تین رکنی بنچ تشکیل دیا، جس کی سربراہی خود انھوں نے کی اور جسٹس کرشنا ڈکشٹ کے علاوہ مسٹر جسٹس جے ایم قاضی کو بنچ میں شامل کیا۔ درخواستوں کی سماعت کے بعد فیصلہ چیف جسٹس نے لکھا، جس سے دیگر دو ججز نے اتفاق کیا۔

حجاب کے خلاف عدالت کا تعصب

فیصلے کا آغاز چیف جسٹس صاحب نے ایک مضمون کے اقتباس (ص ۱۶) سے کیا ہے اور

دلچسپ بات یہ ہے کہ جس مضمون کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ حجاب کی بنیاد پر خواتین کے خلاف امتیازی سلوک نہیں ہونا چاہیے، اسی مضمون سے وہ اقتباس لیا جارہا ہے، جہاں یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ''حجاب نہ تو اسلام کا کوئی لازمی حکم ہے، نہ اس کا ضمیر کی آزادی یا اظہار کی آزادی کے حقوق سے کوئی تعلق ہے!'' بہرحال اقتباس اہم ہے، اس لیے اسے یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

The hijab's history. is a complex one. influenced by the intersection of religion and culture over time. While some women no doubt veil themselves because pressure put on them by society, others do so by choice for many reasons. The veil appears on the surface to be a simple thing. That simplicity is deceiving, as the hijab represents the beliefs and practices of those who wear it or choose not to, and the understandings and misunderstandings of those who observe it being worn. Its complexity lies behind the veil.(Sara Slininger. "Veiled Women: Hijab, Religion and Cultural Practice". *Historia*. 2014. pp 67-68.

اس اقتباس میں جو موقف دیا گیا ہے، فیصلے میں اس کے بالکل برعکس موقف اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ چیف جسٹس صاحب نے یہ اقتباس تنقید کے لیے نقل کیا ہے، بلکہ اس کے برعکس وہ اس مضمون کی ان الفاظ میں تحسین فرماتے ہیں: 'well-researched article'۔ آگے چل کر انھوں نے اس مضمون کا ایک اور اقتباس نقل کیا ہے اور وہاں بھی اس کے برعکس نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کیا ہے۔ پہلے وہ اقتباس (ص ۶۹) دیکھ لیجیے:

Islam was not the first culture to practice veiling their women. Veiling practices started long before the Islamic Prophet Muhammad was born. Societies like the Byzantines, Sassanids, and other cultures in Near and Middle East practiced veiling. There is even some evidence that indicates that two clans in southwestern Arabia practiced veiling in pre-Islamic times, the Banū Ismāʿīl and Banū Qaḥṭān. Veiling was a sign of a women's social status within those societies. In Mesopotamia, the veil was a sign of a woman's high status and respectability. Women wore the veil to distinguish themselves from slaves and unchaste women. In some ancient legal traditions, such as in Assyrian law, unchaste or

unclean women, such as harlots and slaves, were prohibited from veiling themselves. If they were caught illegally veiling, they were liable to severe penalties. The practice of veiling spread throughout the ancient world the same way that many other ideas traveled from place to place during this time: invasion.(حوالہ بالا)

یہاں مصنفہ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ حجاب اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب اور ثقافتوں کا بھی حصّہ رہا ہے۔لیکن فاضل چیف جسٹس صاحب اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ ''حجاب، اسلام کا کوئی لازمی جزو نہیں ہے!'' یہ منطقی مغالطہ اتنا واضح ہے کہ اس پر گفتگو کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حجاب کے حق میں درخواستیں مسترد کرنے کے لیے عدالت نے اس مقدمے میں جو استدلال اختیار کیا ہے، اس کے بنیادی نکات یہ ہیں:

- بھارت کے آئین کے تحت مذہبی آزادی کا حق صرف ان امور تک محدود ہے، جنھیں 'مذہب کا لازمی حصّہ' (essential part of religion) سمجھا جاتا ہے، جب کہ حجاب کو اسلام میں یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔جن امور میں بھارت کا آئین مذہبی آزادی کا حق دیتا ہے، وہاں بھی یہ حق مطلق نہیں ہے بلکہ دیگر حقوق کے ماتحت اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔
- حجاب اختیار کرنے کو ضمیر کی آزادی کے حق یا اظہار کی آزادی کے حق کے تحت بھی نہیں مانا جاسکتا اور مانا جائے تب بھی یہ حقوق مطلق حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان پر ریاست مناسب قیود عائد کرسکتی ہے۔
- حقوق پر عائد کی گئی قیود مناسب ہیں یا نہیں، اس کے لیے بنیادی طور پر معیار یہ ہے کہ وہ سیکولرزم کے ساتھ ہم آہنگ ہیں یا متصادم، اور اس کے تعین کے لیے یہ اصول مدنظر رکھا جانا چاہیے کہ بھارت کا آئین معاشرے میں صرف تکثیریت (diversity) کی حفاظت ہی نہیں چاہتا بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس تکثیریت میں وحدت (unity in diversity) بھی یقینی طور پر پیدا ہو۔

یہاں اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ فیصلے کے آخر میں عدالت نے بھارتی آئین کے مسودے کے لکھنے والوں میں اہم ترین شخصیت ڈاکٹر بی آر امبیڈکر [م:۱۹۵۶ء] کا جو اقتباس نقل کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق عموماً اور حجاب کے متعلق

خصوصاً، عدالت بھی ڈاکٹر امبیڈکر کی طرح کتنی متعصب تھی! اقتباس ڈاکٹر امبیڈکر کی اس کتاب سے ہے، جو ۱۹۴۵ء میں (یعنی تقسیمِ ہند سے قبل، جب تقسیم کے آثار نمودار ہو چلے تھے) شائع ہوئی، اور اس کتاب کا عنوان ہے: *Pakistan or the Partition of India*۔ کتاب کے دسویں مضمون کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ حجاب کا مسئلہ کیسے تقسیمِ ہند کے ساتھ جڑا ہوا ہے:

A woman (Muslim) is allowed to see only her son, brothers, father, uncles, and husband, or any other near relation who may be admitted to a position of trust. She cannot even go to the Mosque to pray, and must wear burka (veil) whenever she has to go out. These burka woman walking in the streets is one of the most hideous sights one can witness in India...The Muslims have all the social evils of the Hindus and something more. That something more is the compulsory system of purdah for Muslim women..... Such seclusion cannot have its deteriorating effect upon the physical constitution of Muslim women..... Being completely secluded from the outer world, they engage their minds in petty family quarrels with the result that they become narrow and restrictive in their outlook..... They cannot take part in any outdoor activity and are weighed down by a slavish mentality and an inferiority complex...*Purdah* women in particular become helpless, timid...Considering the large number of purdah women amongst Muslims in India, one can easily understand the vastness and seriousness of the problem of *purdah*...As a consequence of the purdah system, a segregation of Muslim women is brought about.

عدالت یہ اقتباس نقل نہ بھی کرتی تو فیصلہ مکمل تھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس اقتباس کو نقل نہ کیا جاتا تو تعصب کا اظہار ادھورا رہ جاتا: قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ (آل عمران ۳:۱۱۸) ''ان کے دل کا بُغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے، اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں، وہ اس سے شدید تر ہے''۔

متنازعہ حکومتی حکم نامے کی کمزوریوں سے صرفِ نظر

اب ذرا اس حکم نامے پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے، جس سے اس تنازعے نے جنم لیا۔

۵فروری ۲۰۲۲ءکو حکومت کی جانب سے جاری کیے گئے حکم نامے میں قرار دیا گیا کہ ''صوبے میں تمام اسکولوں میں یونیفارم کی پابندی ضروری ہے''۔ یونیفارم کے تعین کے لیے چار طریقے بیان کیے گئے:

۱- سرکاری سکولوں کے لیے یونیفارم مقرر کرنے کا اختیار سرکار کے پاس ہے؛

۲- پرائیویٹ سکولوں میں سکول انتظامیہ یہ اختیار رکھتی ہے؛

۳- ماقبل یونی ورسٹی کالجز میں متعلقہ کالج کی بہتری یا نگرانی کے لیے قائم کی گئی کمیٹی کے پاس یہ اختیار ہوگا؛ اور

۴- جہاں یونیفارم مقرر نہیں ہے، وہاں ایسا 'ڈریس کوڈ' (dress code) مقرر کیا جائے گا، جو 'مساوات اور یگانگت' (equality and integrity) کو یقینی بنائے اور جس سے 'امن عامہ' (public order) کو نقصان نہ ہو۔

درخواست گزار مسلمان لڑکیوں کی جانب سے بنیادی اعتراض یہ تھا کہ ''حکومت یا سکول انتظامیہ کوئی ایسا یونیفارم ان پر جبری طور پر نافذ نہیں کرسکتی جس میں حجاب کی گنجایش نہ ہو''۔ انھیں خصوصاً اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ ''ماقبل یونی ورسٹی کالجز میں یونیفارم مقرر کرنے کا اختیار جس کمیٹی کو دیا گیا ہے اس میں مقامی سیاست دان بھی شامل ہیں، جو اس معاملے کو سیاسی رنگ دے کر اپنے لیے ووٹ کھرے کرنا چاہتے ہیں''۔ اسی طرح انھیں یہ بھی اعتراض تھا کہ ''یونیفارم کے مسئلے کو امن عامہ کا مسئلہ بنا کر پیش کرنے سے حکومت کے سیاسی عزائم آشکارا ہوتے ہیں کیونکہ وہ بجائے اس کے کہ لڑکیوں کو تنگ کرنے والے عناصر کو لگام ڈالے، الٹا لڑکیوں کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنا لباس تبدیل کرلیں''۔

پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ عدالت نے اپنا سارا زور اس پہلو پر لگایا کہ ''حجاب اسلام کا لازمی حصّہ نہیں ہے اور ہو بھی تو اس کا تحفظ ثانوی حیثیت رکھتا ہے''، لیکن حکومت کے سیاسی عزائم اور اسے امن عامہ کا مسئلہ بنانے کے سوالات کو یکسر غیر ضروری اور غیر اہم قرار دے کر ان کو نہایت مختصر انداز میں کیسے نمٹایا؟ اگر پہلے سوال کے بجائے بحث ان دو سوالات پر ہوتی، تو پہلے سوال پر آنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی اور اس حکم نامے کو بہ آسانی کالعدم قرار دیا جاسکتا تھا۔ لیکن بہت ہی مہارت سے مقدمے کو الٹنے کی کوشش کی گئی اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ 'ہندوتوا' کے

خطرناک عزائم کو سیکولرزم کا لبادہ اوڑھا کر چھپا لیا گیا اور مظلوموں کو ہی مسائل کا سبب قرار دے کر انھی پر ذمہ داری عائد کی گئی! ذرا اس پیرا پر ایک نظر ڈال لیجیے:

The words used in Government Orders have to be construed in the generality of their text and with common sense and with a measure of grace to their linguistic pitfalls. The text context of the Act under which such orders are issued also figure in the mind. The impugned order could have been well drafted, is true.

اس کے باوجود آسکر وائلڈ [م: ۱۹۰۰ء] اور اولیور وینڈل ہومز [م: ۱۹۳۵ء] کے غیر متعلق اقتباسات دے کر اس کمزوری کو ہلکا بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور پھر فرمایا گیا:

the Government Order gives a loose impression that there is some nexus between wearing of hijab and the 'law order' situation.

تنہا یہی بات اس حکم نامے کو کالعدم کرنے کے لیے کافی تھی کہ حجاب اور امن و امان کا باہمی تعلق ہے، اور یہ حکم نامے کا ایک کمزور پہلو ہے۔ لیکن عدالت نے اس کو ایک غیر ضروری اور غیر اہم اعتراض بنا کر اس کو نظرانداز کر دیا۔

جائزہ طلب امور

عدالت نے اس مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے درج ذیل سوالات قائم کیے:

- کیا حجاب لینا اسلام کا لازمی حصّہ ہے، جس کے تحفظ کی ضمانت بھارتی آئین کی دفعہ ۲۵ میں دی گئی ہے؟
- کیا یونیفارم نافذ کرنا غیر قانونی تھا کیونکہ اس سے درخواست گزاروں کے اظہار کے حق اور پرائیویسی کے حق کی خلاف ورزی ہوتی ہے، جن کی ضمانت بھارتی آئین کی دفعات ۱۹ اور ۲۱ میں دی گئی ہے؟
- کیا حکومت کی جانب سے جاری کیا گیا آرڈر بغیر سوچے سمجھے اور واضح طور پر غیر منصفانہ ہے اور اس بنا پر بھارتی آئین کی دفعات ۱۴ اور ۱۵ سے متصادم ہے؟
- کیا مسئول علیہان کے خلاف انکوائری کے لیے، یا کالج کمیٹی میں سیاسی شخصیات کی رکنیت کے خلاف حکم جاری کیا جاسکتا ہے؟

ان سوالات سے ہی معلوم ہوا کہ عدالت نے مقدمے کا کیا رُخ متعین کیا ہے؟ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ فتویٰ کا انحصار استفتا پر ہوتا ہے۔ سوال جس طرح مقرر کیا جائے، جواب اسی کے مطابق دیا جاتا ہے۔ حجاب لینے کے قانونی جواز کے لیے درخواست گزاروں کا استدلال بنیادی طور پر یہ تھا کہ حجاب لینا درخواست گزاروں کے مذہبی تصور کے مطابق ان کے مذہب کا لازمی حصّہ ہے اور اس وجہ سے انھیں اسے ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ایسا کرنا مذہبی آزادی کے اس حق کی خلاف ورزی ہوگی جس کی ضمانت بھارت کے آئین میں دی گئی ہے۔ اس بات کو اس طرح پیش کیا گیا کہ ''چونکہ درخواست گزاروں کا تصورِ مذہب ایک معروضی امر نہیں بلکہ موضوعی (subjective) امر ہے، اس لیے ان کے تصور سے قطعِ نظر، عدالت اس بات کا تعین کرے گی کہ حجاب اسلام کا لازمی حصّہ ہے بھی یا نہیں؟''

غلط سوال کا غلط جواب، اور وہ بھی غلط طریقے سے!

پھر چونکہ عدالت نے درخواست گزاروں کے تصورِ مذہب کو یکسر نظرانداز کر دیا، اس لیے اس نے مذہبی آزادی کے حق کو اظہار کے حق کے ساتھ متعارض قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''درخواست گزاروں کے دلائل باہم متناقض (contradictions) ہیں، حالانکہ درخواست گزاروں کا موقف یہ تھا کہ ''ہم حجاب کو اپنا مذہبی شعار سمجھنے کی بنا پر اسے ضروری سمجھتے ہیں اور لباس انسان کی ذاتی پسند و ناپسند کا معاملہ ہے اور کسی کو ایسا لباس پہننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا جو وہ نہ پہننا چاہتا ہو، نہ اسے ایسا لباس ترک کرنے پر مجبور کیا جاسکتا جسے وہ ترک نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ ایسا کرنے سے اظہار کی آزادی کے اس حق کی پامالی ہوتی ہے، جس کی ضمانت بھارت کے آئین نے دی ہوئی ہے''۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو ان دلائل میں کوئی تضاد نہیں تھا، لیکن عدالت نے کمال بے نیازی سے اس لیے انھیں متناقض قرار دیا کہ اس نے خود بخود درخواست گزاروں کے مذہبی تصور کو یکسر ناقابلِ اعتنا قرار دیا۔

حیران کن بات یہ ہے کہ عدالت نے درخواست گزاروں کے مذہبی تصور کو ناقابلِ اعتنا قرار دینے کے لیے دلیل یہ دی کہ ''عدالت کے سامنے کوئی ایسی شہادت نہیں لائی گئی، جس سے معلوم ہوتا ہو کہ کب سے انھوں نے حجاب پہننا شروع کیا ہے، یا کب سے انھوں نے اسے ضروری سمجھا ہے؟'' یہ امر حیران کن اس لیے ہے کہ جب اس امر کو اظہار کے حق اور پرائیویسی کے حق کے طور پر پیش کیا گیا،

تو اس کے بعد اس سوال کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی کہ کسی نے کسی مخصوص لباس کے متعلق کب اپنی رائے بنائی یا تبدیل کرلی؟

پھر اگر عدالت نے یہی بہتر سمجھا کہ درخواست گزاروں کے تصورِ مذہب کو نظرانداز کر کے معروضی طور پر متعین کیا جائے کہ حجاب کی اسلام میں کیا حیثیت ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس امر کے تعین کے لیے عدالت نے کیا طریقِ کار اختیار کیا؟ کیا اس مقصد کے لیے صرف عبداللہ یوسف علی [م: ۱۰دسمبر ۱۹۵۳ء] کے ترجمۂ قرآن اور حواشی پر انحصار کافی تھا؟ کیا اس انحصار کے لیے یہ دلیل کافی تھی کہ عبداللہ یوسف علی کے ترجمے اور حواشی کو سپریم کورٹ نے کئی مقدمات میں استعمال کیا ہے؟ اس سے بھی آگے بڑھ کر کیا یہ کوئی دلیل ہے کہ صحیح بخاری کے انگریزی ترجمے کو اس لیے مسترد کیا جائے کہ اس کے مترجم ڈاکٹر محمد محسن خان [۱۹۲۷ء- ۱۴جولائی ۲۰۲۱ء] ایک میڈیکل ڈاکٹر ہیں؟ تو کیا ان کے برعکس ڈی ایف ملا [دینشا فردنجی ملا: ۱۸۶۸ء- ۱۹۳۴ء] اور مسٹر آصف علی اصغر فیضی [م:۱۹۸۱ء] کی کتب سے ہی اسلامی قانون سمجھا جاسکتا ہے؟ پھر عدالت کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اسلامی قانون کے مآخذ میں حدیث کی کیا حیثیت ہے اور قرآن و حدیث کے تعلق کے بارے میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہے؟

اوّل تو عدالت کو یہ ذمہ داری اٹھانی ہی نہیں چاہیے تھی کہ وہ متعین کرے کہ ''حجاب کا اسلام میں کیا حکم ہے؟'' پھر اگر اس نے یہ ذمہ داری اٹھانی ضروری ہی سمجھی تھی تو اس کے بعد چاہیے یہ تھا کہ اس معاملے میں صرف ایک کتاب پر انحصار کرنے کے بجائے کئی دیگر مصنّفین اور محققین کے کام کا تجزیہ کرتے ہوئے اس شعبے کے ماہرین سے مدد لیتی۔ اس کے بجائے اس نے صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ عدالت کے سامنے درخواست گزاروں کی جو درخواستیں آئیں ان کے ساتھ کسی 'مولانا' کا بیانِ حلفی جمع نہیں کرایا گیا، جس میں درخواست گزاروں کی جانب سے پیش کی گئی آیات سے استدلال کیا گیا ہو!''

اس فیصلے کا سب سے افسوسناک پہلو یہی ہے کہ جس سوال پر بحث ضروری ہی نہیں تھی، عدالت نے اسی کو بنیادی سوال بنا دیا اور پھر اس سوال کے جواب کے لیے انتہائی ناقص طریقِ کار اختیار کیا۔ یوں مقدمے کے دیگر پہلو اور اصل سوالات پس منظر میں چلے گئے۔ بہرحال، عدالت کا

مقصد پورا ہوگیا ہے، کیونکہ فیصلے کے بعد بھی عام طور پر بحث اسی سوال پر ہورہی ہے اور زیادہ اہم سوالات اب بھی بحث کا حصّہ نہیں ہیں۔ اب ہم انھی سوالات پر بات کرتے ہیں:

عدالتی فیصلے کی چار بنیادیں

آیئے، ان بنیادوں پر بات کریں، جن پر عدالتی فیصلہ کھڑا ہے اور جن پر بحث ضروری ہے، لیکن ان کے بجائے بحث اس بات پر ہورہی ہے کہ حجاب اسلام کا لازمی حصّہ ہے یا نہیں؟

● ان امور میں سرِفہرست یہ امر ہے کہ ''کیا چیز مذہب کا لازمی حصّہ ہے اور کیا نہیں، اس کا تعین اس مذہب کے ماننے والے نہیں کریں گے، بلکہ ریاست کرے گی اور ریاستی تعین کا اظہار عدالتی فیصلے سے ہوگا''۔ یہ امر اس فیصلے کی اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیکولرزم کا مطلب مذہبی رواداری کبھی نہیں ہے اور مذہب میں ریاست کی عدم مداخلت بھی نہیں، بلکہ سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ ریاست ہی ایسی حدود متعین کرے گی جن کے اندر وہ مذہب کو برداشت کرسکتی ہے، اور ان حدود سے تجاوز پر مبنی کسی امر کے اظہار کو وہ عوامی سطح پر نہیں مانے گی، خواہ اس امر کو کسی مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب کا لازمی حصّہ سمجھتے ہوں۔

عدالت نے اس ضمن میں امریکی آئین کے تحت مذہبی آزادی کے حق اور بھارتی آئین کے تحت مذہبی آزادی کے حق کے درمیان موازنہ کرکے یہ دکھایا ہے کہ امریکی آئین کے تحت ریاست پر پابندی ہے کہ وہ کسی مذہب کی ترویج نہیں کرے گی، لیکن افراد کے لیے مذہبی آزادی کا حق، دیگر حقوق کی طرح، غیرمحدود ہے اور اس حق پر عائد قیود و حدود کو استثنا کی حیثیت حاصل ہے۔ مگر اس کے برعکس بھارتی آئین میں مذہبی آزادی کا حق ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور اس پر حدود و قیود کو اصل کی حیثیت حاصل ہے۔

تاہم، امریکی آئین کے متعلق بھی یہ بات مکمل سچائی پر مبنی نہیں ہے اور وہاں بھی مذہب کو تبھی قابلِ برداشت مانا جاسکتا ہے، جب وہ جمہوریت کے ماتحت رہنے پر آمادہ ہو۔ بہرحال، یہ بات اہم ہے کہ عدالت نے بھارتی آئین کے تحت دیے گئے حقوق کو 'ریاست کی مرضی کے تابع' قرار دیا ہے۔ یہ دراصل امریکی قانون دان جیریمی بینتھم [م: ۱۸۳۲ء] اور دیگر قانونی وضعیت پسندوں (legal positivists) کے فلسفے کا اثر ہے کہ ''بھارت میں فرد کے حقوق کا ماخذ ریاست کو سمجھا جاتا

ہے، اور ریاست جب چاہے ان حقوق کو معطل یا ختم کرسکتی ہے اور جو قیود مناسب سمجھے ان پر عائد کرسکتی ہے۔ امریکا میں بینتھم کے برعکس جان لاک [م: ۱۷۰۴ء] کا فلسفہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے، جس کی رُو سے ''انسانوں کو حقوق قانونِ فطرت (Law of Nature) نے دیے ہوئے ہیں اور لوگوں کو یہ حقوق اس وقت بھی میسر تھے جب ریاست کا وجود نہیں تھا، بلکہ ریاست تو اسی لیے وجود میں لائی گئی ہے کہ ان حقوق کا تحفظ کرے''۔

پاکستان میں بھی بھارت کی طرح بینتھم کا نظریہ کارفرما ہے، لیکن اس نظریے کی شدت میں کمی اس بنا پر آئی ہے کہ پاکستان میں اسلامی شریعت کی بالادستی آئینی طور پر تسلیم کی گئی ہے اور اس وجہ سے کسی بھی ریاستی اقدام کے جواز یا عدم جواز کے لیے اسلامی احکام ایک اہم معیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں جب مارشل لا نافذ تھا اور آئین معطل تھا، تب بھی پاکستان کی سپریم کورٹ نے عاصمہ جیلانی کیس میں قرار دیا تھا کہ ''قراردادِ مقاصد کی رو سے، جو ہمارے آئینی نظام کی بنیاد ہے، حاکمیتِ اعلیٰ (Sovereignty)، اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور پاکستانی قوم کے پاس وہی اختیارات ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے تفویض کیے گئے ہیں، جنھیں وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر ہی استعمال کرسکتی ہے''۔ پھر چونکہ اس 'قراردادِ مقاصد' میں یہ بھی تصریح کی گئی تھی کہ حکومت لوگوں کی مرضی سے منتخب کی جائے گی، تو سپریم کورٹ نے یہ بھی قرار دیا تھا کہ مارشل لا غیر آئینی اور ناجائز ہے۔ پاکستان میں سیکولرزم کے گن گانے والے اور اسلامی قوانین پر اندھی تنقید کرنے والے اس حقیقت کو اچھی طرح نوٹ کرلیں کہ یہاں مارشل لا کے عدم جواز کی بنیاد 'قراردادِ مقاصد' بنی، جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا اقرار اور ریاستی اختیارات کے محدود ہونے اور حکومت کے لیے لوگوں کے حقِ انتخاب کی واشگاف وضاحت کی گئی ہے۔

● کرناٹکا ہائی کورٹ کے فیصلے کی دوسری بنیاد یہ امر ہے کہ ''بھارتی آئین کے تحت مذہبی آزادی کا حق، ضمیر کی آزادی سے مختلف اور الگ ہے اور ضمیر کی آزادی کا حق (جس کی رو سے دہریوں اور کوئی مذہب نہ ماننے والوں کا حق بھی تسلیم کیا جاتا ہے) مذہبی آزادی کے حق پر فوقیت رکھتا ہے''۔ اس کے ساتھ تیسرا امر یہ ہے کہ ''ان دونوں حقوق کو دیگر حقوق کی بہ نسبت کمتر حیثیت حاصل ہے اور تعارض کی صورت میں دوسرے حقوق کو ترجیح حاصل ہوگی''۔ یہ دونوں امور

بہت اہم ہیں اور ان سے بھارتی آئینی بندوبست میں مذہب کی حیثیت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد تو ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہییں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ''سیکولرزم مذہبی رواداری اور تحمل و برداشت کا مظہر ہے''۔

● عدالت کو اس بات کی داد ضروری دینی چاہیے کہ اس نے وہ حقیقت بھی سامنے رکھ دی ہے جو انسانی حقوق پر گفتگو کرنے والے بیش تر دانش وَروں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی حق تنہا کوئی مفہوم نہیں رکھتا، بلکہ کسی بھی حق کا مفہوم دوسرے حقوق کے ساتھ اس کے تعلق اور تعارض کی صورت میں ترجیح کے معیار سے متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک تو بھارتی سپریم کورٹ کے ایک اہم فیصلے سے اقتباس نقل کیا ہے، جس میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ عدالت کا کام یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابل آنے والے حقوق میں توازن پیدا کرنے کے لیے آئینی بندوبست کے مطابق ترجیح کا تعین کرے اور پھر یہ مانتے ہوئے کہ لباس کا انتخاب فرد کے حق کا معاملہ ہے، قرار دیا کہ ''یہ حق مقید اور محدود ہے اور اس پر دیگر حقوق کی بنا پر قدغن لگائی جاسکتی ہے:

We have no quarrel with the petitioners' essential proposition that what one desires to wear is a facet of one's autonomy and that one's attire is one's expression. But all that is subject to reasonable regulation.

● عدالت کے فیصلے کے لیے چوتھی اہم بنیاد یہ اصول ہے کہ ''بھارتی آئین کا تقاضا صرف اتنا ہی نہیں کہ بھارت کے کثیر المذاہب اور کثیر الثقافت معاشرے کے تنوع کو محفوظ کیا جائے بلکہ اس سے بڑھ کر اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس تنوع اور تکثیریت کو ایک وحدت بنایا جائے'':

Petitioners' contention that 'a class room should be a place for recognition and reflection of diversity of society, a mirror image of the society(socially ethically)' in its deeper analysis is only a hollow rhetoric. 'unity in diversity' being the oft quoted platitude since the days of IN RE KERALA EDUCATION BILL, supra, wherein paragraph 51reads .....':the genius of India has been able to find unity in diversity by assimilating the best of all creeds and cultures'.

آسان الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے مذہب کا جو بھی تقاضا ہو، آپ نے

بھارتی قوم کی حیثیت کو بالاتر رکھنا ہے اور اس مزعومہ وحدت کے حصول کے لیے آپ کو اپنے مذہب کے الگ الگ رنگوں سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

یہ ہیں وہ چار بنیادی امور، جن پر یہ عدالتی فیصلہ مبنی ہے لیکن بدقسمتی سے ان پر بحث ہی نہیں ہو رہی ہے۔

مذہب کو جمہویت کی پابندی کرنی ہے؟

اس ساری بحث سے معلوم ہوا کہ کرناٹکا ہائی کورٹ کے اس فیصلے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ سیکولر بندوبست کے لازمی تقاضے ہیں۔ بحث کے اس تناظر کو مزید واضح کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں مشہور امریکی قانون دان رونالڈ ڈوورکن کے ایک مختصر لیکن نہایت اہم مضمون پر کچھ بات کی جائے، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ خاکوں کے مسئلے کے پس منظر میں لکھا تھا۔ ڈوورکن کا دو صفحات کا یہ مضمون The Right to Ridicule (تضحیک کا حق) کے عنوان سے روزنامہ نیویارک ٹائمز (۲۳ جون ۲۰۰۶ء) میں شائع ہوا تھا۔

اس مضمون میں دیگر امور کے علاوہ ڈوورکن نے یہ اہم سوال اٹھایا ہے کہ ''خواہ عملی نتائج کے اعتبار سے کارٹونوں کی عدم اشاعت کا فیصلہ حکیمانہ نظر آتا ہو، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اظہار رائے کی آزادی کے حق پر بالخصوص 'کثیر الثقافتی معاشرے' کے تناظر میں قدغن لگائی جاسکتی ہے؟ کیا کسی مذہب کے لیے جو بات توہین آمیز یا مضحکہ خیز ہو، اسے جرم قرار دیا جانا چاہیے؟ اس مضمون میں مرکزی قانونی سوال یہی ہے۔ ڈوورکن نے صراحت کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ 'اظہار رائے کی آزادی' مغربی ثقافت کی کوئی امتیازی خصوصیت نہیں ہے کہ جسے دوسری ثقافتوں کی خاطر، جو اسے نہیں مانتیں، محدود کیا جاسکے، بالکل اسی طرح جیسے مسیحی شعائر کے ساتھ مسلمانوں کے لیے ہلال یا مینارے کے لیے گنجایش پیدا کی جائے۔ اس کے برعکس اس کا کہنا ہے کہ اظہار رائے کی آزادی حکومت کے جواز کی شرط ہے۔ کوئی قانون اور کوئی پالیسی اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک اسے جمہوری طریقے سے نہ بنایا جائے اور جب کسی کو کسی قانون یا پالیسی کے متعلق اپنی رائے کے اظہار سے روکا جائے تو جمہوریت بے معنی ہوجاتی ہے''۔

وہ مزید کہتا ہے کہ ''تضحیک، اظہار کا ایک خاص پیرایہ ہے اور اگر اس کی نوک پلک درست

کرنے یا اصلاح کی کوشش کی جائے تو وہ پیرایہ غیر مؤثر ہوجاتا ہے اور اسی وجہ سے صدیوں سے اچھے یا برے ہر طرح کے مقاصد کے لیے کارٹون اور تضحیک کے ہتھیار استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس بنیاد پر ڈوورکن یہ موقف اختیار کرتا ہے کہ ''جمہوریت میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے، خواہ وہ کتنا ہی طاقت ور یا کتنا ہی کمزور ہو، کہ اس کی توہین یا تضحیک نہیں کی جائے گی''۔ یہاں ڈوورکن اس بات کی وضاحت کے لیے، کہ کیوں جمہوریت میں اظہار رائے کے حق پر قدغن نہیں لگائی جاسکتی؟ کہتا ہے کہ اگر کمزور اور غیر مقبول اقلیتیں یہ چاہتی ہیں کہ ان کے حقوق کا تحفظ ہو اور اکثریت محض اپنی اکثریت کی وجہ سے ان کے حقوق سلب نہ کرسکے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اظہار رائے کے حق پر کوئی قدغن نہ مانیں، خواہ اس کے نتیجے میں خود انھیں بھی تضحیک کا سامنا کرنا پڑے، کیونکہ اقلیت میں ہونے اور کمزور ہونے کے باوجود اظہار رائے کے حق کے ذریعے وہ کسی بھی قانون یا پالیسی کے خلاف کھل کر بات کرسکیں گے۔ اسی استدلال پر وہ مسلمانوں سے کہتا ہے کہ اظہار رائے پر قدغن سے ان کو نقصان ہوگا''۔

اس ضمن میں ڈوورکن اس بات پر بھی بحث کرتا ہے جس کی طرف مسلمان عام طور پر توجہ دلاتے رہتے ہیں کہ کئی یورپی ممالک میں دوسری جنگ عظیم میں یہودیوں کے قتل عام سے انکار کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا ہے اور اظہار رائے پر اس قدغن کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مسلمان بالعموم اسے دوغلی پالیسی اور منافقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ڈوورکن کہتا ہے کہ مسلمانوں کا یہ اعتراض بالکل درست ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اظہار رائے پر ایک اور قدغن بھی مان لیں۔ اس کے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ مذکور قدغن بھی دور کردی جائے۔

ڈوورکن مزید یہ کہتا ہے کہ اگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ایسے قوانین اور پالیسیاں ختم کی جائیں، جو مسلمانوں کی پروفائلنگ کو جواز دیں یا جن کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے سے دکھائی دینے والے لوگوں کی نگرانی کی جائے کیونکہ ان پر دہشت گردی کا شبہہ ہوتا ہے، تو پھر مسلمانوں کو اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی رائے کو بھی برداشت کرنا پڑے گا جو انھیں دہشت گردی سے منسلک کرتے ہیں اور کارٹونوں کے ذریعے ان کی تضحیک کرتے ہیں، خواہ ان لوگوں کی یہ بات کتنی ہی بے بنیاد اور بذات خود مضحکہ خیز ہو!

آخر میں وہ ساری بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

Religion must observe the principles of democracy, not the other way around. No religion can be permitted to legislate for everyone about what can or cannot be drawn any more than it can legislate about what may or may not be eaten. No one's religious convictions can be thought to trump the freedom that makes democracy possible.

مذہب پر لازم ہے کہ وہ جمہوریت کے اصولوں کی پابندی کرے، نہ کہ الٹا جمہوریت کو مذہب کا پابند بنایا جائے۔ کسی مذہب کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ سب کے لیے یہ قانون بنا سکے کہ وہ کیسا خاکہ بنا سکتے ہیں اور کیسا نہیں، بالکل اسی طرح جیسے وہ ہر کسی کے لیے یہ قانون نہیں بنا سکتے کہ وہ کیا کھا سکتے ہیں اور کیا نہیں۔ کسی کے مذہبی اعتقادات کے متعلق یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ اس آزادی کو فتح کرلیں گے جو جمہوریت نے ممکن بنادی ہے۔

ڈوورکن کے اس اقتباس کو بار بار پڑھیے اور اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا مذہب کو جمہوریت کے اصولوں کی پابندی اختیار کرنی چاہیے یا جمہوریت کو مذہبی قیود کی پابندی تسلیم کرنی چاہیے؟ جب تک اس بنیادی مسئلے پر بحث نہیں کی جائے گی، ضمنی سوالات پر بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی سوال پر بحث سے ناروے یا دیگر مغربی ممالک (اور اسی طرح بھارت) میں مقیم مسلمانوں کی مجبوریاں بھی سمجھ میں آجاتی ہیں اور یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ کیوں وہ صبر وتحمل اور اعراض کا رویہ اپنانے کی تلقین کرتے ہیں؟

حقیقتِ امر یہ ہے کہ بھارت کے مسلمانوں کو ایک دفعہ پھر معرکۂ روح و بدن پیش ہے اور یہ فیصلہ بھارت کے مسلمانوں نے ہی کرنا ہے کہ اس کے ہاتھوں میں دل ہے یا شکم؟